# مدرسہ نظام تعلیم: درپیش مسائل اور لائحہ عمل، ڈاکٹر محمود احمد غازی کے نقطہ نظر کا جائزہ

Madrasah Education System: Problems under Consideration and Course of Action A Review of the Viewpoint of Dr. Mahmoud Ahmad Ghazi

کلثوم پراچہ: اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ علوم اسلامیہ و تقابل ادیان، دی ویمن یونیورسٹی ملتان
منزہ حیات: اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ علوم اسلامیہ، بہاءالدین زکریا یونیورسٹی ملتان

**Abstract:**
The educational system of religious alma maters has remarkable impacts on the religious values and ethics of Pakistani society. Their opinion is of considerable value in the worshipping and family matters of everyday life. But, on account of the demand of society and of the time, a lot of questions are raised on the conduct of these scholars. One of the most likable subjects of Dr. Mahmood Ahmad Ghazi (d2010) is the education system of religious institutions i.e.Madaris and their renaissance. He remained in touch to the research and educational departments after being qualified from both systems of education schools. In this way he was very much aware of the worldly affairs as well as the educational systems of madaaris. He gave more importance to interior aspects of the system than to make the foreign aspects of the system of education. And this too is the need of the hour that own mistakes must be avoided.Dr. Ghazi remained in strife to introduce a comprehensive and balanced system of religious and ethical system in outer world especially in Pakistan. He used to present significant analyses and suggestion on the Madrasa system of education in his lectures. In this article his point of view on Madrasa education has been highlighted and evaluated.
**Keywords**: Sub-Continent's Religious Education, Madrasa System, Current Challenges, Madrasa Reforms, Dr.MahmoodGhazi.

پاکستانی معاشرہ کے مذہبی اقدار و تصورات پر دینی مدارس کے نظام تعلیم کے قابل ذکر اثرات پائے جاتے ہیں۔ مساجد کے نظام میں ان مدارس کے فضلاء کو کلیدی اہمیت حاصل ہے۔ روزمرہ کے عبادتی اور عائلی مسائل میں ان مدارس کی رائے کو معتبر خیال کیا جاتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی عصری تقاضوں اور سماجی مطالبات کے حوالہ سے ان کے کردار پر سوالات بھی اٹھائے جاتے ہیں۔ برصغیر کے مسلم عہد حکومت (1005ء–1857ء) میں دینی مدارس کے نظام تعلیم کی حیثیت ایک متحرک اور مؤثر نظام کی رہی

ہے اور مذہبی تقاضوں کی تکمیل کے ساتھ سماجی اور ملکی ضروریات کی انجام دہی کی صلاحیت کو جِلادینا بھی اس کے پیش نظر رہا ہے۔

اس نظام تعلیم کی پیداوار مجدد الف ثانی[1] جیسی شخصیت تھی۔ جنہیں دنیائے اسلام میں اسلامی تاریخ کے دوسرے ہزار یئے کا مجدد تسلیم کیا گیا۔ جن کو علامہ اقبال(م 21 اپریل1938 ء)نے مسلم ہندوستان کا سب سے بڑا دینی نابغہ (Genius Religious)قرار دیا[2]۔ اسی نظام تعلیم کے ذریعہ اس دَور کے دوسرے تمام اہل علم، اربابِ سیاست و حکومت اور اصحاب ادب و دانش منظرِ عام پر آئے۔ چنانچہ حضرت مجدد صاحب اور سلطنت مغلیہ کے وزیر اعظم نواب سعد اللہ خان علامی[3] مرحوم دونوں ہم درس تھے۔ وہ ایک ہی درس گاہ میں اور ایک ہی استاد کے سامنے زانوئے تلمّذ تہہ کر کے تیار ہوئے تھے۔ تاج محل جیسی عالمی شہرت کا شاہکار اور د[4]یگر عظیم الشان اور دوسری عظیم الشان عمارتیں بنانے والا انجینئرَ احمد[5] جیسا ماہر تعمیرات بھی انہی درس گاہوں کا پڑھا ہوا تھا۔[6]

چنانچہ آج سے دوڈھائی صدی قبل برصغیر کے دینی مدارس جو کردار ادا کر رہے تھے۔ وہ اگرچہ ہمارے انحطاط کا دَور تھا تاہم اس وقت بھی مدارس میں قابلِ لحاظ علمی معیار تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ان مدارس میں طلبہ علم ہیئت (فلکیات کا علم، Astronomy )پر اعلیٰ گفتگو کر سکتے تھے جو آکسفورڈ[7] اور کیمبرج[8] یونیورسٹی کے طلبہ نہیں کر سکتے تھے۔ یہی وہ مدارس تھے جہاں سے منتظم تیار ہو کر آرہے تھے۔ جہاں سے ملک کے نہری نظام اور بلند پایہ تعمیرات کے معمار نکل رہے تھے۔ جہاں عساکر کے قائد اور طبیب تربیت پا رہے تھے۔ ان مدارس کے علاوہ مسلم دنیا میں کوئی الگ نظام تعلیم وجود نہیں رکھتا تھا۔[9]

مسلم دور حکومت میں ہندوستان میں علوم کے اختصاص کے حوالہ سے کئی نصاب رائج تھے۔ جن میں سے ڈاکٹر محمود احمد غازی[10] تین کا خاص طور پر ذکر کرتے ہیں۔

1. ایک نصاب جون پور وغیرہ مشرقی ہندوستان میں رائج تھا۔ یہاں عقلیات اور فلسفے پر زور دیا جاتا تھا۔اور یہاں کے فارغ التحصیل حضرات منطق[11] اور فلسفہ کے ماہر ہوتے تھے۔
2. دوسرا نصاب افغانستان کے اثرات سے آیا تھا۔ جو موجودہ خیبر پختونخوا،افغانستان اور موجودہ پنجاب میں رائج تھا۔ یہاں عربی گرائمر (صَرف ونحو)پر زیادہ توجہ تھی۔
3. تیسرا نصاب وہ تھا جو مغربی ہندوستان اور سندھ میں رائج تھا۔ جس میں علم حدیث پر نسبتاً زیادہ زور تھا۔

بعد ازیں اورنگزیب عالمگیر[12] نے اس دور کے معروف عالمِ دین ملا نظام الدین سہالوی[13] کو یہ ذمہ داری سونپی کہ وہ ایک جامع نصاب مرتب کریں ،انہوں نے موجودہ نصاباتِ تعلیم کو مد نظر رکھتے ہوئے جو نصاب مرتب کیا،وہ ان کے نام سے درس نظامی کہلایا اس میں انہوں نے منطق، فلسفہ ، نحو اور حدیث کے ساتھ ساتھ اصولِ فقہ اور فقہ کی بنیادی کتابیں بھی شامل کر دیں۔اس طرح ان تینوں نظاموں کو جو اس وقت رائج تھے، یکجا کر دیا گیا اور اس کا اجراء فرنگی محل[14] میں کیا گیا،[15] اس نصاب کے فضلاء ریاستی نظام بالخصوص عدالتی نظام میں کلیدی کردار ادا کرنے لگے حتیٰ کہ جب اٹھارہویں صدی عیسوی میں ایسٹ انڈیا کمپنی [16] نے دہلی کے حکمران شاہ عالم (م 19 نومبر 1806 ) سے دیوانی خریدی تو کمپنی کے زیر انتظام علاقوں کے بارہ میں یہ امر بھی معاہدہ کا حصہ تھا کہ وہاں کا عدالتی نظام بدستور فقہ حنفی کے مطابق چلتا رہے گا۔[17] چناں چہ کمپنی کے کارپردازوں نے بھی اپنے اہتمام میں درس نظامی کے کئی ادارے قائم کیے تھے۔

بعد ازیں برصغیر میں انگریز نے غلبہ پاتے ہی اپنے نوآبادیاتی نظام کے تقاضوں کے تحت ایک ایسے نظام تعلیم کا اجراء کیا جس کا فارغ التحصیل طبقہ اس کے نظام اور یہاں کے عوام کے مابین رابطہ کاری کے فرائض انجام دے سکے۔ اور مقامی آبادی کے دل میں فدویانہ

جذبات کی پرورش کر سکے۔یہی وجہ ہے کہ یہ نظامِ تعلیم اپنے ملک کے برعکس برصغیر کو جدید سائنسی علوم سے براہِ راست مستفید نہ کر سکا، نہ صرف یہ بلکہ انگریز نے یہاں کی زرعی معیشت میں جاگیرداری کا وہ فرسودہ نظام متعارف کرایا جس کو وہ اپنے ملک میں رد کر کے صنعتی دَور میں داخل ہوا تھا۔ یہاں کے پنچائتی نظام کی جگہ پیچیدہ عدالتی نظام نافذ کر کے مقدمات کے گورکھ دھندہ میں یہاں کی رعایا کو جکڑ کر رکھ دیااور اپنے ملک میں ریاستی سطح پر مذہبی غیر جانبداری (سیکولرزم) کو اختیار کرنے کے باوجود برصغیر میں فرقہ واریت کے فروغ کواپنے اقتدار کے استحکام کے لئے ناگزیر تصور کیا۔[18]

پاکستان میں دینی مدارس کی تعلیم کو زیر بحث لانے کے لیئے ضروری ہے کہ اس کا پس منظر ذہن میں رکھا جائے کہ جب انگریز نے پورے برصغیر پر مکمل قبضہ کر لیاتو مسلمانوں کے تمام تعلیمی ادارے بند کر دیئے، تمام اوقاف پر پابندی لگادی، علماء کرام جو نظام چلا رہے تھے ان کو ملازمتوں سے الگ کر دیا گیا، شرعی عدالتوں کی بجائے انگریزی عدالتوں نے جگہ لے لی، ریاستی زبان کے طور پر فارسی ختم کر کے انگریزی زبان رائج کر دی گئی، بڑے بڑے مناصب پر انگریز افسران آ گئے۔الغرض انگریزی نو آبادیاتی دور میں سابق حکمران ہونے کے ناطے مسلمانوں کو سرکاری سطح پر ایک حریف کے طور پر دیکھا گیا،ان کے نظام سلطنت کے باقیات کو چن چن کر ہدف بنایا گیااور وہ تمام چیزیں جو مسلمانوں کے لئے باعث عزت و وقار تھیں باعث ذلت بنا دی گئیں۔

ان نامساعد حالات میں مذہبی طبقہ کا عمومی رجحان اپنے کمزور وسائل کے ذریعہ دینی علوم کے تحفظ کے لئے مدارس کے قیام کی طرف ہوااور انہوں نے درس نظامی کو کچھ ترامیم کے ساتھ اپنا نصاب تعلیم قرار دے کر افراد سازی کی محنت شروع کر دی ان افراد کا مطمح نظر اپنے اپنے علاقوں میں روز مرہ کی مذہبی ضروریات (نماز باجماعت، نماز جنازہ، خطبہ نکاح، اذان و

تلاوت، بچوں کو قرآن کے الفاظ کی تعلیم وغیرہ) کی تکمیل قرار پایا جبکہ معاشرے کے سرگرم شعبوں میں کردار ادا کرنے کی گنجائش نہ ہونے کے سبب وہ ان شعبوں کی علمی تقاضوں سے اپنے آپ کو باخبر رکھنا بھی ضروری تصور نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ درس نظامی کا نصاب تعلیم عمل کے میزان میں محدود مذہبی سرگرمیوں کا نصاب بن کر رہ گیا[19]

تاہم مذہبی طبقہ میں ایسا حلقہ اور شخصیات بھی موجود تھیں جن میں مذہب کی ان محدود مگر نہایت بنیادی اور ضروری سرگرمیوں کے ساتھ درپیش بدیسی نظام سے گلو خلاصی کے ساتھ ساتھ معروضی تقاضوں کے حوالہ سے بھی گہرا تفکر پایا جاتا تھا گو ان کی تعداد گنی چنی تھی۔ ان کے فہم وبصیرت میں درسِ نظامی کا محض اعادہ نہیں تھا، بلکہ وہ اس کو نئے حالات کے لئے مطلوبہ راہ نمائی کا ایک ناگزیر ذریعہ تصور کرتے تھے۔ 1866ء میں جب دیو بند (ضلع سہارن پور) میں ایک مدرسہ قائم کیا گیا تو اس کے بانی مولانا محمد قاسم نانوتوی (م1880ء) نے اس کو 1857ء کی جنگ آزادی کی علمی بازگشت قرار دیا، چناں چہ ان کے منصوبہ تعلیم کا یہ حصہ تھا کہ دیو بند کی تعلیم کی تکمیل کے بعد طلبہ عصری علوم سے بھی اپنی واقفیت بہم پہنچائیں تاکہ درپیش مسائل کے حوالہ سے اپنا نقطہ نظر متعین کر سکیں۔ علاوہ ازیں اختصاصی سطح پر امام شاہ ولی اللہ (م1762ء) کی کتب کو بھی شاملِ نصاب کیا گیا۔ اور یوں اس نصاب سے اس وقت کے ہندوستان کے دینی تقاضے پورے ہونے لگے جس میں کم وسائل میں رہتے ہوئے اساتذہ وطلبہ خدمت دین کے جذبہ سے سرشار تعلیم وتعلم میں مصروف رہے اور بعد ازیں یہاں کے فضلاء، معاشرہ کی ابتدائی دینی ضروریات کی تکمیل کے لیئے مصروف عمل رہے[20]، تاآں کہ جب 1947ء میں برطانوی استعمار سے آزادی حاصل ہوئی تو نہ صرف مدارس کے نظام تعلیم میں کوئی بنیادی تغیر نہیں آیا بلکہ ان مدارس کا سلسلہ وسعت پذیر بھی ہوا۔ یہ دینی مدارس ایسی فلاحی خدمت کر رہے ہیں جس کا مقابلہ پاکستان میں کسی بھی

بڑے سے بڑے فلاحی ادارہ سے نہیں کیا جاسکتا۔ یہ پورے پاکستان کے غریب ترین طبقے کے کم و بیش پندرہ لاکھ بچوں کو تحفظ، خوراک اور اور بنیادی اور ضروری دینی تعلیم دے رہے ہیں۔ اور وہ اس سارے کام کا سرکاری خزانے پر کوئی بوجھ نہیں ڈالتے۔ یہ مدارس عام لوگوں میں خواندگی کو فروغ دے رہے ہیں، غریب طبقہ کے بچوں کو سنبھالا دے کر معاشرے کی مین سٹریم میں داخل کر رہے ہیں [21]۔ تاہم اس نظام کے حوالہ سے کئی پہلو یقینا توجہ طلب ہیں ، جن کی نشاندہی سے مقصود دراصل اس نظام کو ملکی اور ملی تقاضوں کے حوالہ سے زیادہ متعلق اور مؤثر بنانے کی اہمیت اجاگر کرنا ہے۔

ڈاکٹر محمود احمد غازی ان معدودے شخصیات میں سے ہیں جن کی مدرسہ نظام تعلیم پر گہری نظر تھی، ان دلچسپی کے موضوعات میں سے ایک اہم موضوع، دینی مدارس کے نظام تعلیم کی نشاۃ ثانیہ سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ مدرسہ کے نظام تعلیم کے فارغ التحصیل ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی تدریسی اور تحقیقی زندگی میں عصری تعلیمی و تحقیقی اداروں سے وابستہ رہے۔ اس طرح انہیں مدارس کے نظام تعلیم سے بھرپور اور براہ راست واقفیت کے ساتھ ساتھ عصری تقاضوں سے کماحقہ شناسائی تھی۔ مدارس کے نظام تعلیم کے حوالے سے بیرونی ایجنڈے کو موضوع بنانے کی بجائے انہوں نے اس نظام کے داخلی پہلوؤں پر زیادہ توجہ دی۔ ڈاکٹر غازی کے حوالہ سے دینی مدارس کے نظام تعلیم کے اصلاح طلب اہم امور کی نشان دہی کچھ اس طرح سے کی جاسکتی ہے۔

## نظریہ تعلیم میں ثنویت کا تصور:۔

ڈاکٹر صاحب ملت اسلامیہ کی ہم آہنگی، یک جہتی اور یک رنگی کے لئے نظام تعلیم کی یک سانیت کو نہ صرف ایک لازمی شرط قرار دیتے ہیں بلکہ وہ اس حوالہ سے دوٹوک رائے رکھتے ہیں کہ ایسی ہر صورت حال جس سے مسلمان دو مختلف طبقوں یا ایک سے زائد طبقوں

میں تقسیم ہو جائیں، تباہ کن ہے خواہ وہ طبقے تعلیم کے نام پر قائم کیے جائیں یا وہ طبقے مالی آمدنی کی کمی بیشی کے نام پر بنائے جائیں یا رنگ اور نسل کی بنیاد پر استوار کیے جائیں۔ان طبقوں کی بنیاد پر الگ الگ تعلیمی، دینی اور مذہبی اداروں کا وجود اسلام کے مزاج کے خلاف اور غیر اسلامی ہے۔ چناں چہ وہ اسی تناظر میں ملک میں دینی اور غیر دینی تعلیم کے نظری طور پر جداگانہ تصور کو ملک و ملت کی وحدت اور یک جہتی کے منافی قرار دیتے ہیں اور ان کی رائے میں اس سے روزانہ آنے والا ہر لمحہ اور ہر صبح طلوع ہونے والا سورج ملک میں دوئی، ثنویت اور افتراق کے جراثیم لے کر آ رہا ہے۔ اور یہ دوئی سیکولرزم [22] کے فروغ میں ممد و معاون ثابت ہو رہی ہے [23] عام طور پر سیکولرزم کی ترویج کے حوالہ سے عصری تعلیم گاہوں کے نظام تعلیم کو ذمہ دار تصور کیا جاتا ہے، مگر ڈاکٹر غازی اس کے ساتھ مروجہ مذہبی نظام تعلیم کو بھی اس سے بری الذمہ قرار نہیں دیتے اور خبر دار کرتے ہیں کہ اگر دینی قیادت پر فائز حضرات کا خدانخواستہ تصور سیکولر ہی ہے کہ مذہب اہل مذہب کے لئے ہے اور دنیا اہل دنیا کے لئے ہے، قیصر کو قیصر کی چیز دے دو اور پادری کو پادری کا علاقہ دے دو [24]۔ تو پھر بے شک دین و دنیا کی تفریق کا یہ ابلیسانہ تصور ہے۔ [25]

ڈاکٹر صاحب حصول آزادی سے قبل اور اس کے بعد کے تقاضوں کے مابین جوہری فرق کی نشاندہی کرتے ہوئے اس کے مطابق حکمت عملی میں تبدیلی کو ضروری قرار دیتے ہیں، چناں چہ وہ کہتے ہیں کہ یہ امر واقع ہے کہ انگریزوں کے دَورِ استبداد میں اس دوئی کو برداشت کرنے کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں تھا کیوں کہ انگریز کے لئے یہ ناقابل برداشت تھا کہ ملک کا نظام بنکاری و معاشی نظام، ہمارے دین اسلام سے جڑا ہو یا اس پر ذرا برابر بھی دینی اثرات ہوں لیکن چونکہ ہمارے پاکستان کے قیام مقصد ہی اسلام کے احکامات کا نفاذ تھا تو ہمیں لازمی طور پر ایسے ادارے قائم کرنے چاہئیں جن کی اساس ہی اسلام کے بنیادی اصولوں پر مبنی ہو۔اسلام میں تو

دینی اور دنیاوی تعلیم کے الگ الگ ہونے کا کوئی تصور نہیں اور وہ دین اور دنیا دونوں ضروریات کو پورا کرتا ہے. جب کہ نظامِ تعلیم میں موجودہ ثنویت کا نظام ہمیں مغربی سیکولرزم کی طرف دھکیل رہا ہے۔[26]

ڈاکٹر غازی دین و دنیا کی تفریق کے اس نظریہ کو اسلام کے لئے انتہائی خطرناک تصور کرتے ہیں۔ان کی رائے میں اسلامی تاریخ میں بارہ تیرہ سو سال تک کوئی ایسی صورت حال پیدا نہیں ہوئی جہاں علوم و فنون میں دین و دنیا کی تفریق اور دوئی پائی جاتی ہو اور وہاں کبھی ثنویت کے نظریہ کو پذیرائی ملنے کی نوبت نہیں آئی بلکہ فکری یک جہتی، نظریاتی ہم آہنگی اور معاملات کو دیکھنے کا موحدانہ نقطہ ءنظر ہی جاری وساری رہا چناں چہ دنیااسلام کے باہر سے بھی جو علوم و فنون یا کوئی فکری چیز مسلمانوں میں آئی خواہ وہ یونان کے علوم و فنون ہوں یا آتش پرستوں اور ہندوؤں کے، ان سب کو مسلمانوں نے اپنے رنگ میں ایسے رنگ لیااور اسلامی فکران میں اس طرح جاری وساری کر دی کہ بعد میں یہ اندازہ لگانامشکل ہو گیا کہ کون سی چیز اغیار سے آئی تھی اور کون سی چیز خود مسلمانوں کی فکری و تہذیبی عطا تھی۔ڈاکٹر صاحب اس سلسلہ میں منطق کی مثال پیش فرماتے ہیں کہ یونانی منطق ایک غیر اسلامیماحول میں شروع ہوئی مگر جب وہ دنیائے اسلام میں داخل ہوئی تو مسلمانوں نے اس کو از سر نو مرتب کر کے اسلامیعلوم وفنون سے ہم آہنگ کر لیا کہ آج امام غزالی[27]اور امام رازی[28]جیسے اکابر اسلام کی تحریریں دیکھ کر یہ اندازہ نہیں ہو سکتا کہ کوئی ایسا بھی وقت تھا کہ ان علوم وفنون کااسلامی علوم سے کوئی تعلق نہیں تھااور آج کیفیت یہ ہے کہ یونانی علوم و منطق کو پڑھے بغیر امام غزالی اور امام رازی جیسے اکابر کی کتابیں پڑھنااور سمجھ لینا ممکن نہیں۔[29]

ڈاکٹر غازی ملک میں نظام تعلیم کو مذہبی اور غیر مذہبی دھاروں کی تقسیم کو کسی طور قبول کرنے کے لیئے آمادہ نہیں بلکہ وہ اسے سیکولر ایجنڈا تصور کرتے ہیں، یہ حقیقت ہے کہ دو

متوازی نظام ہائے تعلیم ہمارے ملک میں خاص طور پر اور دنیائے اسلام میں عام طور پر دین و دنیا میں تفریق کے نظریہ کو فروغ دے رہے ہیں اور یوں سیکولرزم کے مغربی تصور کو پروان چڑھارہے ہیں کیوں کہ سیکولرزم کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ دینی تعلیم اور مذہبی ہدایت ور ہنمائی کو زندگی کے عملی میدان سے نکال دیا جائے جیسا کہ مغرب اور دیگر کئی ممالک میں ہو رہا ہے۔ ہمارے ملک میں تعلیم کے ان دو متوازی نظاموں کی وجہ سے اس کو مزید مہمیز مل رہی ہے کہ تعلیم کے ایک نظام کا دائرہ مسجد تک محدود رہے اور دوسرا نظام، زندگی کے بقیہ سب پہلوؤں کو چلاتا رہے تو اس اعتبار سے سیکولرزم ہمارے ملک میں آچکا۔ چنانچہ ہمارے ملک دینی اور غیر دینی اداروں کے نام سے جو تعلیمی ادارے قائم ہیں اس سے نہ صرف ملک وملت کی یک جہتی متاثر ہو رہی ہے اور دونوں اداروں کے فضلاء کے مابین منافرت پھیل رہی ہے بلکہ یہ دین اسلام کے تصورِ وحدت کے بھی سراسر منافی ہے۔ جس سے ملک وملت اور دین کی بنیادیں کھوکھلی ہو رہی ہیں۔ اور اس طرح کے کھوکھلے نظام کو ہم میں سے بہتوں نے قبول کر لیا ہے اور ان کے ذہنوں میں یہ بات پختہ ہو گئی ہے کہ دین داروں کے لئے الگ تعلیمی و تربیتی ادارے ہیں اور دنیاداروں کے لئے الگ ادارے ہیں اور ان الگ الگ اداروں میں جا کر ہی اپنے اپنے مقاصد کو بروئے کار لایا جاسکتا ہے۔ دین و دنیا کے لئے الگ الگ اس فکری نظریہ کو نہ صرف عوام نے قبول کر لیا ہے بلکہ اسی نظریہ پر اپنی زندگیوں کو ڈھال لیا ہے اور اسی پر عمل پیرا ہیں۔ اس حوالہ سے ڈاکٹر غازی بہت حساس نظر آتے ہیں اور ان کے لہجہ میں مبنی بر اخلاص تلخی بھی محسوس ہوتی ہے وہ کہتے ہیں "اگر اجازت دی جائے تو سخت لفظ استعمال کرنا چاہتا ہوں کہ یہ دوئی سیکولرزم کے فروغ میں ممد و معاون ثابت ہو رہی ہے [30] اس کی ایک وجہ ان کی نظر میں یہ ہے کہ مدارس کے اکثر طلبہ و اساتذہ میں جو خالصتاً دینی علوم کے حوالہ سے اب وہ تعمق گہرائی، سنجیدگی اور وہ متانت جو ان مدارس کا شاندار طرہ امتیاز تھی، نظر نہیں آتی۔

ڈاکٹر غازی وحدت فکری کے لئے ملکی نظامِ تعلیم میں روایتی اور جدید ہر دو علوم کی ضرورت اور اہمیت پر بہت زور دیتے تھے اور اس تقاضے کو شدت سے محسوس کرتے ہوئے اس کی طرف بھرپور توجہ دلاتے ہوئے اپنے تئیں ہر ممکن کوشش کی کہ جدید مسائل کو دینی تناظر میں دیکھا جائے وہ اس افسوس ناک حقیقت کی جانب توجہ دلاتے ہیں کہ تحقیق و جستجو کا ذوق نہ عصری جامعات کے فضلاء میں ہے اور نہ دینی مدارس کے فارغ التحصیل حضرات میں ، اس لئے کہ تعلیم کے مقاصد واہداف ہر دو جگہ پر واضح نہیں کہ ان کی رائے میں ایک جگہ ملازمت کا حصول مقصد ہے اور دوسری طرف امامت و خطابت کا گو مدارس کے طلبہ کو اس حوالہ سے ایک گونہ برتری حاصل ہے کہ اگر کسی موجود مسجد میں امامت و خطابت میسر نہ ہو تو اس مقصد کے لئے جہاں بس چلے ، نئی مسجد کھڑی کی جاسکتی ہے۔اور اس نئی مسجد کے وجود کا جواز پیدا کرنے کے لئے فقہی اور مسلکی حوالوں کو بڑی سہولت کے ساتھ پکارا جاسکتا ہے۔[31]

واضح رہے کہ ڈاکٹر محمود احمد غازی دینی مدارس کے موجودہ نظام تعلیم کے ساتھ ساتھ عصری تعلیمی اداروں میں دی جانے والی علوم اسلامیہ کے نظام تعلیم کو بھی غیر تسلی بخش قرار دیتے ہیں بلکہ اس کی کارکردگی ان کی نظر میں بہت کم درجے کی ہے۔ان کے الفاظ میں سرکاری اداروں سے ایم۔اے کرکے آنے والوں کا علم بڑا ناپختہ ہوتا ہے ، وہ اردو کتابیں پڑھ کر امتحان پاس کر لیتے ہیں ان میں سے اکثر افسوس ناک حد تک قرآن پاک ناظرہ بھی نہیں پڑھ سکتے اور اگر ان میں سے کسی کو نماز پڑھانے کا کہہ دیا جائے تو نماز بھی نہیں پڑھا سکتے بلکہ قرآن پاک کو صحیح تلفظ کے ساتھ پڑھ بھی نہیں سکتے[32]۔

## سماجیات سے لاتعلقی کا رجحان:

ڈاکٹر غازی دینی مدارس کے نظام تعلیم کی اس حوالے سے صراحت کے ساتھ نشاندہی کرتے ہیں کہ آج کا معاشرہ جس زبان میں بات سمجھتا ہے ، اس زبان میں دینی مدارس

کا فاضل بات نہیں کرتا کیوں کہ اس نے جس اصطلاح واسلوب میں علوم حاصل کیئے ہیں وہ معاشرے کے لیئے نامانوس تصور ہوتے ہیں، چناں چہ وہ معاشرے کے مقتضیات سے لا تعلق تصور کیا جانے لگا،ان کے الفاظ میں دَورِ جدید کا آدمی جس فریکونسی پر بات سمجھتا ہے، عالم دین اس فریکونسی پر آپریٹ نہیں کرتا۔اس صورت میں دینِ حق کے پیغام کو دَور جدید کے آدمی تک پہنچانے کی ایک شکل تو یہ ہے کہ پوری دنیا کے لوگوں کو اسلامی علوم پڑھائے جائیں جو بظاہر مشکل معلوم ہوتا ہے لہذا دوسری صورت یہی ہو سکتی ہے جس طرح امام غزالی اور امام رازی نے اپنے اپنے دَور میں منطق اور فلسفہ پڑھا تھا، علمائے کرام بھی چند ضروری اور جدید علوم کو اس حد تک پڑھ لیں کہ ان کو معلوم ہو جائے کہ دَورِ جدید کا آدمی جس ماحول، اسلوب اور جس زبان میں سوال کرتا ہے۔اسی اسلوب اور اسی زبان میں اسے جواب دیا جا سکے۔ان کا کہنا تھا کہ جدید دنیا میں اگر قوت محرکہ اور قوت نافذہ کے طور پر اسلام کا وجود باقی رہنا ہے۔(یقیناً رہے گا) تو اس کے لئے ایسے افراد کا وجود ناگزیر ہے۔

اس بات کو انہوں نے مثال سے واضح کیا کہ خلیفہ راشد ثانی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے جب ایک مرتبہ کسی شخص کو خصوصی ذمہ داری سونپنے کے لیئے اپنے ساتھیوں سے مشورہ لیا تو لوگوں میں سے کسی نے اس کے حق میں کہا کہ وہ بہت متقی اور پرہیزگار اور اتنے نیک ہیں کہ کانہ لا یعرف الشر (گویا وہ شر کو جانتے ہی نہیں) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فوراً جواب دیا مجھے ایسا شخص نہیں چاہیے جو شر کو نہیں جانتا۔اس لئے کہ من لا یعرف الشریو شک ان یقع فیہ[33] (جو شر کو جانتا ہی نہیں اس کا شر میں پڑنے کا زیادہ امکان ہے) لہٰذا معلوم ہوا کہ ہر دور کے شر سے بچنے کے لئے اس شر کی نوعیت واسباب کا جاننا بھی ضروری ہے۔کیوں کہ کئی بار شر، خیر کے لبادے میں ہوتا ہے اور سادہ لوح شخص دھوکے کا شکار ہو جاتا ہے۔[34] اسی طرح ایک مرتبہ حضرت حذیفہ رضی اللہ

تعالیٰ عنہ سے کہا گیا کہ ہم آپ کو دیکھتے ہیں کہ آپ ایسی باتیں کہتے ہیں جو آپ کے علاوہ کسی اور صحابی سے سننے میں نہیں آتیں، آپ نے یہ کہاں سے لیں؟ انہوں نے کہا حضور ﷺ نے میرے ساتھ مخصوص معاملہ کیا۔ عام لوگ آپ سے خیر کے بارے میں پوچھتے اور میں آپ سے شر کے بارے میں پوچھتا تھا اس ڈر سے کہ کہیں میں اس میں مبتلا نہ ہو جاؤں اور ایک مرتبہ انہوں کہا من لا یعرف الشر لا یعرف الخیر۔[35](جو شر کو نہیں جانتا وہ خیر کو بھی نہیں جانتا.)

ڈاکٹر غازی نے اپنے مؤقف کو ایک اور مثال سے بھی واضح کیا ہے ، جس سے مدارس کے موجودہ نظام تعلیم میں متعلقہ خلا کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے، امام محمد بن حسن الشیبانی [36]جب اپنی کتابیں مرتب کر رہے تھے تو انہوں نے یہ اہتمام کیا تھا کہ اپنے وقت کا کچھ حصہ بازار میں گزاریں اور مختلف تجارتی و بازاری سرگرمیوں کا بذات خود جائزہ لیتے رہا کریں تاکہ ان کو یہ پتہ چلے کہ کاروبار کیسے ہوتا ہے[37] آپ معاشرے کے ساتھ تعلق رکھنے کی کوشش کرتے، تاکہ نص کی عدم موجودگی میں آپ کی فقہی آراء، لوگوں کے تعامل اور ان کے اندر جاری عرف ورواج کے زیادہ قریب، ان کے لیئے آسان، اور ان کی مصلحت اور فائدے پر مبنی ہوں، نیز ان آراء سے تنگی و مشکل کا ازالہ ہو۔ جن کا کاروباری طبقہ کو سامنا کرنا پڑتا ہے تاکہ اسلامی فقہ کی تدوین میں ان مشکلات کے ازالہ کو ملحوظ رکھا جا سکے۔[38]یہی وجہ ہے کہ فقہ اسلامی میں یہ بات اصول کے درجے میں ذکر کی جاتی ہے من لایعرف اھل زمانہ فھو جاھل[39](جو اپنے زمانے کے حالات نہیں جانتا وہ جاہل ہے) مراد یہ ہے کہ فقیہ جو بننا چاہتا ہے اس کو زمانہ کے حالات و واقعات، مسائل و مشکلات سے گہری واقفیت ہو۔ اور وہ قرآن وسنت میں بھی گہرا فہم وادراک رکھتا ہو گویا کہ جو شخص بھی مفتی، قاضی، عالم، فقیہ کے درجے پر فائز ہو معاشرے کے مسائل، عرف ورواج، لوگوں کے مزاج وعادات کی گہری

سمجھ بوجھ رکھتا ہوتا کہ وہ استفسار پر قرآن وسنت سے اپنے علم کے مطابق تسلی بخش اور قابل فہم استدلال کر سکے جس سے مستفتی کو تسلی و تشفی حاصل ہو اور مسائل موقع پر ہی سلجھائے جا سکیں۔

## فنی تعلیم کی اہمیت کے اعتراف کی ضرورت:۔

ڈاکٹر غازی تعلیم کے حوالے سے ایک جاندار اور وسیع نظریہ رکھتے ہیں، وہ دینی نقطہ نظر سے ایک جامع نظام تعلیم کے قیام کے خواہاں تھے جس میں دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ جدید فنی تعلیم کی مطلوبہ اہمیت کو تسلیم کیا جائے اور اس کو دنیوی تعلیم کہہ کر مسترد نہ کیا جائے وہ کہتے ہیں کہ دینی نظام تعلیم کے ساتھ ساتھ جدید فنی علوم کی تعلیم از حد ضروری ہے کہ وقت کی تبدیلی کے ساتھ مختلف علوم وفنون کی اہمیت بڑھتی چلی جاتی ہے اور فنی مہارتوں کی ہر دور کے لحاظ سے ضرورت اور اہمیت بدلتی رہتی ہے۔ایک زمانہ میں منجنیق جدید ہتھیار تھا، آپ ﷺ نے چند صحابہ کو یمن بھیجا کہ وہ وہاں کے غیر مسلموں سے منجنیق بنانا سیکھ کر آئیں اور وہاں سے لے کر بھی آئیں۔[40] رسول اللہ ﷺ نے طائف کے معرکہ میں وہ استعمال بھی فرمائیں۔[41] منجنیق کو آج کے ٹینک کا پیش رو کہہ سکتے ہیں وہ ایک بہت بڑی گاڑی ہوا کرتی تھی جو قلعوں کی دیوار وغیرہ توڑنے میں استعمال ہوتی تھی۔[42] اس سلسلہ میں انہوں نے امام غزالی[43] اور ابن تیمیہ[44] کے حوالہ سے ایسی تمام مہارتوں اور تحقیقات کا حاصل کرنا مسلمانوں کے ذمہ فرض کفایہ[45] قرار دیا ہے جن کے نہ ہونے کی وجہ سے مسلمان غیر مسلموں کے محتاج بن کر رہیں۔مسلمانوں کو غیر مسلموں کی محتاجی سے بچانا، ان اپنے تمام دینی اور دنیاوی معاملات میں خود کفیل بنانا اور تمام معاشرتی تقاضوں میں توازن رکھنا، مسلم معاشرہ اور ریاست کے ذمے فرض کفایہ ہے یہی سبب ہے کہ جب مسلم عہد کے قرون وسطی میں فقہ کی تعلیم سے دنیاوی فوائد حاصل کیئے جاتے تھے کہ لوگ فقہ پڑھ کر مفتی،

قاضی اور گورنر بن جاتے تھے اس دور میں امام غزالی نے اس امر کا اظہار کیا تھا لوگ فقہ تو بہت پڑھتے ہیں طب (میڈیکل) ہندسہ (انجینئرنگ) کوئی نہیں پڑھتا۔ اس وقت امام غزالی نے اس طرف توجہ دلائی تھی اور اس کو فرض کفایہ قرار دیا تھا تاکہ مسلمان، غیر مسلم طبیب اور انجینئروں کا محتاج نہ رہے۔ گویا دینی علوم کے ساتھ ساتھ دنیاوی علوم و مہارتوں کی بھی بے حد ضرورت ہے۔ مسلمانوں نے اپنے دَورِ عروج میں اس امر کو پیشِ نظر رکھا کہ عصری تقاضوں کو سمجھ کر ان کے مطابق حکمتِ عملی ترتیب دی جائے۔ جیسے آج سے تقریباً بارہ تیرہ سو سال پہلے جب یونانیوں کے علوم و فنون کی کتب کا ترجمہ عربی زبان میں شروع ہوا تو قریب قریب وہی صورت حال پیش آئی جس سے ہم آج دوچار ہیں۔ یونانی منطق مسلمان علماء اور فضلاء کی بنائی ہوئی نہ تھی۔ افلاطون (م 347 ق م) اور ارسطو (م 322 ق م) کوئی متقی لوگ نہیں تھے بلکہ بت پرست اور مشرکین تھے۔ لیکن جب ان کا تیار کردہ علم منطق مسلمانوں میں رائج اور مقبول ہونا شروع ہوا تو ان کے قبول ورد کے حوالہ سے اس وقت بھی بحث ہوئی تھی کہ بعض اہل علم کی رائے تھی کہ ان کو نہیں سیکھنا چاہیے۔ اس وقت بھی اس طرح کے فتاوی تھے کہ ان کا سیکھنا حرام اور ناجائز ہے جس طرح آج ہمارے ہاں ایک محدود مذہبی طبقہ کے نزدیک انگریزی زبان اور جدید علوم کے بارے میں یہی رائے ہے۔ لیکن دوسری رائے کو پذیرائی حاصل ہوئی جو وقت کے تقاضا کے مطابق بہت اہم اور درست تھی کہ یونانی علوم سیکھ کر ہی جائزہ لیا جا سکتا ہے کہ کون سی چیز اسلامی نقطہ نظر سے قابل قبول ہے اور کون سی چیز نا قابل قبول اور غلط ہے، لہذا ان امور کو دلائل کے ترازو میں تولا جا سکتا ہے لیکن جدید علوم و فنون سے استفادہ کرنے میں تامل نہیں کرنا چاہیے،[46] اس سلسلہ میں انہوں نے حدیث کا حوالہ دیا کہ حکمت و دانائی مسلمانوں کے لئے گمشدہ میراث ہے۔[47]

ڈاکٹر غازی کہتے ہیں کہ ہمارے علمی سرمایہ میں امام غزالی کی المستصفی[48]، امام رازی کی تفسیر کبیر[49]، امام شاطبیؒ کی الموافقات[50] جیسی کتب اپنے موضوعات میں اپنا ثانی نہیں رکھتیں۔ لیکن علمِ منطق سے واقفیت کے بغیر ان کو پڑھا اور سمجھا نہیں جاسکتا اسی طرح امام شاہ ولی اللہ کی حجۃ اللہ البالغہ[51] میں بھی یونانی علوم و فلسفہ کی اصطلاحات استعمال کی گئی ہیں جبکہ برصغیر میں دینی فلسفہ پر اس سے بہتر کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جو چیز پہلے کسی حلقہ میں دین کے حوالہ سے خطرہ سمجھی گئی تو وہی بعد میں خادمِ دین بن گئی۔[52]

دینی نظام کے لیئے عصر شناسی کی اہمیت:۔

ڈاکٹر غازی، ماضی کی روشن روایات کے تسلسل میں کہتے ہیں کہ دینی علوم کے ساتھ دوسرے علوم وفنون جن کی آج کے دور میں اہمیت اور ضرورت بڑھ گئی جیسے انگریزی زبان، معاشیات، ریاضی، کمپیوٹر وغیرہ نہ صرف ان علوم کو حاصل کرنا چاہیے بلکہ دینی مدارس میں ان کو لازمی مضمون کی حیثیت حاصل ہونی چاہیے تاکہ فارغ التحصیل طلبہ اور علماء کرام بقدر ضرورت جدید معاشیات، بنکاری کا نظام، بین الاقوامی لین دین اور تجارت سے واقف ہوں کیونکہ ان جدید علوم سے بنیادی اور ضروری واقفیت کے بغیر پاکستان کے نظام کو اسلامی خطوط پر استوار کرنا ناممکن ہوگا کیونکہ ایسے اہل علم جو اسلامی شریعت کے عمیق فہم کے ساتھ ساتھ دنیوی تعلیم بھی رکھتے ہیں دور جدید کے اسلوب میں اپنی بات کو بہتر انداز میں بیان کرسکتے ہیں اور ان کی بات کا غیر معمولی اثر بھی ہوگا۔[53]

ڈاکٹر غازی جہاں اس امر کو فرضِ کفایہ قرار دیتے ہیں کہ ایسے ماہرین پیدا کیئے جائیں جو شریعت کا عمیق فہم اور تعلیم و تربیت کے ساتھ جدید تقاضوں کے مطابق فنی مہارت سے بھی آراستہ ہوں۔ وہاں اس امر کی واشگاف الفاظ میں وضاحت کرتے ہیں کہ وہ دینی نظامِ تعلیم کے بنیادی اہداف کسی صورت تبدیل کرنے کے خواہاں نہیں کہ ان اداروں کا بنیادی مقصد دینی

علوم کے محققین، محدثین، مفسرین، فقہاء، مبلغین اور عربی دان پیدا کرنا ہے۔ان اداروں کا مقصد ہر گز یہ نہیں کہ ان میں محدثین، مفسرین، متکلمین اور فقہائے اسلام کی بجائے کمپیوٹر کے ماہرین پیدا ہوں۔ یہ دینی تخصص اور دینی رجال کار کی تیاری کے ادارے رہیں گے لیکن آج کا تقاضا ہے کہ دینی مدارس کے متخصص، علماء، فقہاء، محدثین، مفسرین اپنی تخصیصی مہارت سے معاشرے کی تعمیر و تشکیل میں اپنا کردار ادا کریں، جس کے لیئے ملکی نظام کو دینی سانچہ میں ڈھالنے اور اس کے مطابق ملک کے مختلف اداروں کی تشکیل نو کے لئے بعض ایسی جزوی، معنوی تبدیلیوں اور مہارتوں کی ضرورت ہے جس کے بغیر دورِ جدید میں دینی تعلیم کے تقاضوں پر کماحقہ عمل درآمد نہیں کیا جاسکتا۔ دینی تعلیمی نظام کا ہدف آپ کے رائے میں یہ ہے کہ ایسے اہل علم تیار کیے جائیں جو ایک طرف اسلام کی تعلیمات کو تعمق اور گہرائی کے ساتھ سمجھتے ہوں، اخلاق کردار میں آئمہ سلف کی تعلیم اور اسوۂ حسنہ کا نمونہ ہوں تو دوسری طرف وہ دورِ جدید اور نئی تعلیم کے چیلنجز کو ایک ناقد کی حیثیت سے سمجھتے ہوں اور سمجھنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہوں۔

دینی تعلیم کی عصر شناسی کی خصوصیت کے برعکس موجودہ دینی نظام کے تحت بالعموم جو فاضلین تیار ہوتے ہیں وہ دین کو موجودہ زندگی اور روز مرہ معاملات سے متعلق کرنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے۔ وہ جدید مسائل کو حل کرنا تو درکنار ان کو سمجھنے سے بھی قاصر ہوتے ہیں۔[54] کیونکہ جو مسائل ان طلبہ کو پڑھائے جاتے ہیں ان کا کسی طور پر معاشرے اور خاص طور پر جدید مسائل سے تعلق نہیں ہوتا اس لئے فارغ التحصیل طلبہ و فضلاء کو اس سے کوئی سروکار نہیں ہوتا کہ دَور جدید میں کون کون سے مسائل درپیش ہیں اور دینی تناظر میں ان کو کیسے حل کیا جاسکتا ہے۔اسی کا نتیجہ ہے کہ دینی مدارس سے فارغ التحصیل

طلباء عام طور پر معاشرہ میں صرف اور صرف مسجد میں نماز پڑھانااور فروعی مسائل پر تقریر کرنارہ جاتاہے۔اس کے علاوہ معاشرہ کے دیگر امور سے لاتعلق سمجھے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر محمود احمد غازی صاحب اسی ضمن میں ایک واقعہ بیان فرماتے ہیں کہ "ایک نہایت قابل احترام بزرگ سے ملنے کی سعادت حاصل کی۔ جنہوں نے ہر ایسے موضوع پر کسی قسم کی گفتگو کرنے، گفتگو میں حصہ لینے یا گفتگو میں شریک ہونے سے صاف انکار کر دیا جس کا مقصد یہ ہو کہ دینی مدارس کی پیداوار یا دینی مدارس کے طلبہ کا معاشرے میں مسجد کی خدمت کے علاوہ بھی کوئی اور کردار یا رول ہو سکتاہے "بلکہ ایک بزرگ نے واضح اور دوٹوک الفاظ میں ان سے کہا کہ "ہم تو مسجد کے ٹکڑوں پر پلنے والے کٹھ ملاہی تیار کرناچاہتے ہیں اس کے علاوہ ہمارا کوئی مقصد نہیں۔ دینی مدارس اس وقت تک ہی قائم رہ سکتے ہیں جب تک ان کو صرف مسیتیئے پیدا کرنے ہوں"۔[55]

## فرقہ واریت میں دلچسپی کا رجحان:۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مسجد کی خدمت ایک بہت بڑی سعادت ہے بشرطیکہ اس کو معاشرے سے متعلق مسائل کی دینی رہنمائی کی نیت سے انجام دیا جائے،تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ محدود دینی نظامِ تعلیم کے تحت جب فرقہ وارانہ مسائل میں دلچسپی پیدا کر دی جاتی ہے تو مسجد غیر متعلق مسائل کی تعلیم گاہ بن جاتی ہے اور فروعی مسائل کی بنیاد پر اختلافات کو فرقہ وارانہ رنگ دے دیا جاتاہے۔ چنانچہ جب وہ مدارس سے فارغ ہو کر نکلتے ہیں تو جو کچھ انہوں نے مدارس میں پڑھا ہوتاہے اس کو معاشرہ اور گردوپیش کے لحاظ سے غیر متعلق پاتے ہیں اور ان مسائل کا اطلاق کہاں اور کیسے کیا جائے اس چیز کو وہ سمجھنے سے قاصر ہوتے ہیں لہٰذا وہ مسائل حل کرنے کی بجائے معاشرے میں ان مسائل کو پیدا کرنے کا باعث بنتے ہیں،جن سے عوام کا کوئی دُور کا واسطہ نہیں ہوتااس طرح انہیں الجھا کر رکھ دیا جاتاہے جس سے معاشرہ

میں انتشار، منافرت اور گروہیت پیدا ہوتی ہے۔ اور بجائے عوام کے معاشرتی مسائل حل کرنے کے وہ فروعی مسائل میں پھنسا دیئے جاتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ آج ہمارے دینی مدارس سے فارغ التحصیل طلبہ رسول اللہ ﷺ کے نور اور بشر ہونے کے مسئلے، روحانی بیعت کے وجوب کے مسئلے نماز باجماعت میں، آمین بالجہر یا بالسر کے مسئلے، رمضان المبارک میں بیس یا آٹھ تراویح کے مسئلے، رسول اللہ ﷺ کے جسم اطہر کا سایہ تھا یا نہیں، نذر و نیاز کے مسئلے اور وسیلہ وغیرہ کے مسائل پر تو نہایت فصیح و بلیغ گفتگو کریں گے۔ لیکن امت مسلمہ کے دوسرے اہم عالمی مسائل سے بالکل ناواقف اور نابلد ہیں۔[56]

ہمارے مذہبی حلقوں میں ایک بہت بڑاالمیہ یہ ہے کہ علمی و فقہی حتی کہ تعبیر کے اختلاف کو بھی اسلام و کفر جیسا اختلاف بنالیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی تحریروں اور خطبات میں اس جاہلانہ رویہ سے بچنے پر زور دیتے ہیں کہ اس طرح کے فروعی اختلافات میں شدت نقصان دہ ہے اور ان پر لڑنے جھگڑنے کا کوئی جواز ہی نہیں بلکہ اس کے برعکس آنحضور ﷺ نے صحابہ کرام کو ایک سے زائد نقطہ ہائے نظر اپنانے کی اجازت دی۔ جیسے غزوہ خندق کے بعد حضور ﷺ نے صحابہ کو جلد از جلد بنی قریظہ کے علاقہ میں پہنچنے[57] اور نماز عصر وہاں جا کر پڑھنے کا حکم دیا[58]۔ بعض نے یہ سمجھ کر حضور ﷺ کا مقصد وہاں پہنچ کر نماز عصر پڑھنے کو لازم قرار دینا نہیں تھا بلکہ ممکن حد تک جلدی پہنچنا تھا راستہ ہی میں نماز عصر پڑھ لی، جب کہ دیگر نے وہاں پہنچنے پر نماز عصر ادا کرنا لازم سمجھا نتیجتاً راستہ میں سورج غروب ہو گیا اور انہوں نے نمازِ عصر اس کے بعد ادا کی مگر حضور ﷺ نے کسی کو بھی غلط قرار نہ دیا گویا صحابہ میں فہم دین میں اختلاف رائے ہوتا تھا ایک صحابی ایک عمل کو سنت سمجھتے تو دوسرے صحابی دوسرے عمل کو۔[59]

موجودہ دینی نظامِ تعلیم کے فضلاء میں فرقہ واریت کے درآنے کی ایک وجہ اس کے نظام میں قرآنِ حکیم کی تعلیم کی مرکزی اور بالادست حیثیت کا نہ ہونا بھی ہے، چناں چہ اس حوالہ سے ڈاکٹر غازی کہتے ہیں آج کل درس نظامی میں جو چیز سب سے زیادہ نظر انداز ہو رہی ہے وہ قرآن پاک ہے جس پر سب سے کم توجہ دی جاتی ہے۔ اب مدارس میں اول سے آخر تک قرآنِ حکیم کا صرف ترجمہ پڑھادیا جاتا ہے جس کی نوعیت اس عام درس سے مختلف نہیں ہوتی جو عام مسجدوں میں بھی ہو رہا ہے۔ جسے عام لوگ بیٹھ کر سنتے ہیں، کچھ یاد رہا کچھ نہ رہا، اسی طرح عملاً تفسیر قرآن تو طلبہ کو پڑھائی نہیں جاتی۔ وہ مزید کہتے ہیں کہ "میں نے جید علماء میں سے بھی بہت سوں کو دیکھا کہ علم تفسیر[60] سے واقف ہیں نہ علوم قرآن[61] سے آشنا ہیں جو کہ مسلمانوں کے کارنامے ہیں۔ اکثر لوگوں کو بڑی تفسیروں کے نام بھی پتہ نہیں ہوتے "اور اگر تفسیر قرآن کی تعلیم ہوتی بھی ہے تو طلبہ کا ایک سانچہ بنا کر ان کو قرآن پاک کی تفسیر پڑھائی جاتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے خیال میں یہ قرآن پاک کی توہین ہے کیوں کہ قرآن اصل سانچہ اور معیار ہے، قرآن کے سانچے سے باقی علوم کو جانچنا چاہیے، لہذا قرآن کے معیار اور کسوٹی پر فقہ اور اصول فقہ، عقائد اور ہر چیز کو جانچنا چاہیے۔ لہذا یہ بات طے نظر آتی ہے کہ موجودہ درسِ نظامی کے مروجہ طریقہ کار میں قرآن سے براہِ راست سمجھنے اور استنباط کرنے کی سعی ہی نہیں کی جاتی کیوں کہ اکثر و بیشتر قرآن پاک کو عام دیگر کتابوں کی مانند پڑھایا جاتا ہے جس سے طالب علم کچھ سمجھ سکتا ہے نہ استاذ کچھ اخذ کر سکتا ہے۔ گویا طریقہ تعلیم و تدریس میں قرآن مقدس اور دیگر کتابوں میں کوئی فرق و امتیاز نہیں رہتا۔ اسی بنا پر قرآن پاک سے براہ راست استنباط کرنے اور جدید عصری مسائل کو قرآن مجید کی روشنی میں حل کرنے کی صلاحیت ہی پیدا نہیں ہوتی جس سے طلبہ قرآن پاک کی مہارت سے محروم رہ جاتے ہیں۔ یوں عملاً مدارس کا مروجہ نظام تعلیم و تربیت اس حوالہ سے طلبہ میں حصولِ ہدایت و رہنمائی اور آیات احکام

سے اخذ واستنباط کی بجائے محض حصولِ ثواب کا رہ جاتا ہے، حالاں کہ اگر قرآن پاک کی تعلیم و تدریس حاصل کرنے والے طلباء وطالبات، قرآنِ حکیم کی اصل روح اور اس کا منشا سمجھ جائیں کہ قرآن ہم سے کیا چاہتا ہے اور اپنے اندر کتنی وسعت اور جامعیت رکھتا ہے تو پست فکر و نظر سے ان کی گلو خلاصی ہو جائے اور وہ قرآن کے اخلاق و صفات سے لذت آشنا ہو جائیں۔[62] قرآن کا دیا ہوا نظریہ تفکر و تدبر، غور و فکر اور مشاہدہ اگر اپنا لیا جائے اور اس کو اپنی زندگیوں میں اوڑھنا بچھونا بنالیا جائے تو ان کا لوہا دنیا کے ہر میداان میں مانا جائے گا۔

## تین درجاتی نصابِ تعلیم :۔

ڈاکٹر غازی صاحب نہ صرف مسائل کی واضح نشان دہی کرتے ہیں بلکہ وہ ان کے حل کے لیئے واضح نقطہ نظر بھی رکھتے ہیں چناں چہ ملکی نظامِ تعلیم میں کم از کم معیار تعلیم میٹرک کے ساتھ حفظ قرآن کی شرط لازمی قرار دینے کی تجویز دیتے ہیں، اس کے بعد وہ دینی تعلیم کے حوالہ سے تین درجاتی نصاب کی تجویز دیتے ہیں۔[63]

1. پہلی سطح پر تین سال کا ایک نظام اور نصاب ایسا ہونا چاہیے جس میں بقدر ضرورت عربی پڑھائی جائے تاکہ طالب علم تفسیر حدیث اور فقہ کی کتابیں پڑھ سکے پھر اس کو حدیث، علم حدیث، تفسیر عربی وار دو کی چند بہترین تفاسیر پڑھائی جائیں اسی طرح چند کتب فقہ و معاشیات کی پڑھائی جائیں مزید اس کو تقریر و تجوید قرآن کی مشق بھی کرائی جائے اس طرح کا نصاب مکمل کرنے والا امام بنے گا تاکہ اس کا مزید وقت اور وسائل کا ضیاع نہ ہو۔
2. دوسری سطح پر ابتدائی تین چار سال کے بعد مزید تین سال کا ایک نصاب ہونا چاہیے۔ جس کا مقصد صرف اور صرف سکول، کالجوں کے لئے اسلامیات کے معلم تیار کرنا ہوں۔

3. تیسری سطح کا مقصد ایسے افراد کی تیاری ہے جو اعلیٰ درجے کے متخصص ہوں جو اعلیٰ درجے کے علوم و فنون کی تدریس کر سکیں، اس کے لئے چار پانچ سال کی تیاری درکار ہو گی۔

**خلاصہ کلام:**

ڈاکٹر غازی، دینی مدارس کے نظامِ تعلیم کے حوالہ سے اخلاص پر مبنی اصلاح آمیز ناقدانہ نظر رکھتے تھے جو ان کی قلبی بصیرت اور شعوری تجزیہ کی آئینہ دار ہے، ان کی رائے میں:

1. ماضی میں مدارس کے نظام کو معاشرہ کی تشکیل و تنظیم کے امور سے براہ راست تعلق رہا ہے، جس کی وجہ سے اس کے نصاب میں ان مضامین کو بھی ترجیحی طور پر جگہ دی جاتی رہی جن کی سماجی انتظام و انصرام میں اہمیت تسلیم شدہ تھی اور ریاستی مناصب پر بھی اسی نظام کے تعلیم یافتہ افراد فائز ہوا کرتے تھے۔
2. جب یورپ میں صنعتی انقلاب آیا تو اس کے مابعد اثرات نے براہ راست یا نو آبادیاتی نظاموں کے ذریعہ انسانی معاشروں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تو کئی سماجی شعبوں کی میکانکیت تبدیل ہو گئی اور کئی نئے شعبوں نے اپنی جگہ بنانی شروع کر دی۔ اس دور کے ادارے، تصورات اور معاہدات کے لئے بڑی خصوصی مہارتیں درکار ہیں اس حوالہ سے ضروری قرار پاتا ہے کہ مدارس کے نظام تعلیم کے کارپردازان اس تبدیلی کا ادراک کریں مگر اس جانب مطلوبہ توجہ موجود نہیں ہے۔
3. عملاً مدارس کا نظام تعلیم عصری واقفیت سے الگ تھلک ہو کر رہ گیا جس کی وجہ سے موجودہ زندگی اور روز مرہ کے امور کو دین کے حوالہ سے جانچنے کی صلاحیت کا عملی طور پر فقدان پایا جاتا ہے، جس کے نتیجہ میں دینِ اسلام کی سماجی امور کی راہ نمائی کا تصور دھندلا کر رہ گیا ہے یوں معاشرہ میں دین و دنیا کی تقسیم کے نظریہ کو تقویت حاصل ہو رہی ہے۔

4. مدارس کے نظامِ تعلیم میں ایسے مسائل اور موضوعات زیر بحث رہتے ہیں جو معاشرے سے غیر متعلق ہو چکے ہیں اور جب ان موضوعات کو معاشرہ میں زیر بحث لایا جاتا ہے تو اس سے علمی اور عملی پیچیدگیاں جنم لیتی ہیں۔

5. دینی مدارس سے تحصیل علم کے بعد فاضلین کو نسبتاً زیادہ معاشی اور معاشرتی ناہمواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور ان کے لئے مساجد میں امامت نماز اور مدارس کی تدریس کے علاوہ کسی اور شعبہ زندگی میں خدمات کی انجام دہی کا کوئی تصور نہیں اور بات محض ایک معروضی حقیقت تک محدود نہیں رہی، بلکہ ارباب مدارس نے اس کو بطور نظریہ قبول کر کے اس کی حوصلہ افزائی کو اپنی پہچان بنالیا ہے،اصلاح احوال کے لئے ضروری ہے کہ نہ صرف اس نظریہ کو مسترد کیا جائے بلکہ مدارس کے نظام تعلیم کے معاشرتی شعبوں میں بامعنی کردار کی راہوں کو بھی تلاش کیا جائے۔

6. مدارس کے نظام تعلیم کے معاشرتی تقاضوں سے الگ تھلگ کیے جانے یا ان کے ذمہ داران کی اپنی محدود ترجیحات کے سبب، اس میں بہت سے جزیروں کی شکل میں ذیلی نظاموں نے جنم لیا ہے۔ باہمی مربوط اور مرکزی نظام نہ ہونے کے سبب دینی تعلیم کو مسلکی تربیت کے غلاف میں ملبوس کر دیا گیا ہے، جس کی وجہ سے مدارس کے فضلاء کے ہاں بالعموم تبلیغ دین اور تبلیغ مسلک ایک دوسرے کے مترادف قرار پاتے ہیں حتی کہ مدارس کے نظام تعلیم میں مسلکی آرا اور فقہی اجتہادات پر اتنا زور دیا جاتا ہے کہ عملی زندگی میں ان کا پرچار ہی دعوت دین تصور ہونے لگتا ہے، جبکہ دعوت دین کے لئے مسلکی سرگرمیوں سے بالاتر ہونا ازبس ضروری ہے۔

7. مدارس کے نظام تعلیم کی نشاۃ ثانیہ کے لئے اہم اصلاحات کی ضرورت ہے، ڈاکٹر محمود احمد غازی نے اپنے عہد وزارت (مذہبی امور) میں ماڈل دینی مدارس کا منصوبہ بھی

متعارف کرایا جس میں ایک متوازن نصاب کی تفصیلات بھی شامل تھیں۔ جس سے استفادہ یقیناً ارباب حل وعقد کے لیئے موزوں ہو گا۔

الغــــرض وطن عزیز میں نہ صرف ایسے اداروں کے قیام کی ضرورت ہے جہاں روایتی دینی تعلیم اور عصری تعلیم کے دونوں دھارے آکر مل جائیں بلکہ ہر دو موجود تعلیمی دھاروں میں بھی اتنی گنجائش ضرور ہونی چاہیے کہ وہ اپنا اپنا تشخص برقرار رکھنے کے باوجود ایک دوسرے سے علمی استفادہ کر سکیں۔ جدید نظام تعلیم میں اتنی وسعت ہو کہ دینی تعلیم سے فارغ التحصیل لوگ اندر سما سکیں اور حصول علم کی جدوجہد میں وہ تنہا و اکیلے نہ ہوں بلکہ ایک سطح پر ان کا حصہ بن جائیں۔اس طرح دونوں نظاموں کے مخلص اور باصلاحیت افراد مل کر ایسی نئی راہیں استوار کریں گے جس سے پیدا شدہ خلیج کو کم کیا جا سکے گا اور یوں دونوں نظام ایک ہی جامع نظام کا حصہ بن سکیں گے اور باہم ہم آہنگی، وسیلے، رابطے اور پل کے ذریعہ ہر دو ایک دوسرے کے تعلیمی نظام میں سما سکیں گے، ہر دو نظاموں کے درمیان خلیج کو کم کیا جا سکے گا اور اجنبیت کی بجائے اپنائیت کی فضا پیدا ہو گی جس سے نہ صرف منزل مقصود تک پہنچنے میں مدد ملے گی بلکہ مبینہ استعماری قوتوں کی سازشوں کو بھی ناکام بنانے میں مدد ملے گی۔

## حوالہ جات وحواشی

[1] شیخ احمد سرہندی المعروف مجدد الف ثانی، امام ربانی (1564ء-1624ء/971ھ-1034ھ) آخری زمانے میں ہندوستان کے افق پر جلوہ گر ہونے والی شخصیت ہیں۔آپ نے تجدیدی کام کا آغاز فرمایا ،آپ نے خاص توجہ فرمائی کہ مختلف سلسلوں کے انتہا پسند افراد نے جو افراط و تفریط کا ماحول پیدا کر رکھا تھا،اسے اعتدال کے راستے پر لے آئیں۔ طریقت میں نقش بندی اور فقہ میں حنفی تھے۔ مجدد الف ثانی کا مفہوم دوسرے ہجری ہزاریئے میں دین کا احیاء کرنے والے۔انہوں نے مغل بادشاہ اکبر اور جہانگیر کے عہد میں در کر آنے والی بدعات کی اصلاح کی ،جس کے اثرات بعد کی تمام اسلامی تحریکات پر مرتب

ہوئے ۔ (.سید محمد میاں، مولانا، علماءِ ہند کا شاندار ماضی، جمیعت پبلیکیشنز لاہور، 2010ء حصہ اول ،ص13وغیرہ)

[2]Iqbal,Muhammad,Dr. The Reconstruction of Religious Thought in Islam, (edit.M.Saeed Sheikh )Iqbal Academy Pakistan, Lahore,p.152(Lecture no. 7 "Is Religion Possible")

[3]نواب سعد اللہ علامی(م 1655ء) کو علم سے انتہائی محبت لاہور کے مدرسہ، جو کہ مسجد وزیر خان کے ساتھ تھا کھینچ لائی تھی، بعد میں وہ دہلی چلے گئے جہاں آپ اپنی ذہانت اور خطیبانہ صلاحیت سے مغل بادشاہ شاہ جہاں (مدتِ حکومت 1628-1658ء) کے دربار پہنچے ان کے علم پر عبور سے شاہ جہاں بہت متاثر ہوا اور ان کو ملازمت کی پیش کش کر دی، بطور وزیر خزانہ ان کی سچائی اور دیانت داری سے بے حد متاثر ہونے پر ان (نواب سعد اللہ علامی) کو علامہ فہمی اور جمالۃ الملک کا خطاب دیا، 250000 لاکھ کا انعام دیا ۔(https://www.pakistantoday.com.pk/2017/12/07/main-khans-tomb/) اور ڈاکٹر غازی کے بقول نواب سعد اللہ خان وہ سیاست دان ہیں جو شاہ جہاں کے دور میں پورے ہندوستان کے وزیر اعظم تھے۔یعنی موجودہ افغانستان ،موجودہ پاکستان، موجودہ ہندوستان، موجودہ مشرقی پاکستان، موجودہ سری لنکا، اور موجودہ نیپال کم از کم یہ چھ ملک اتنی بڑی سلطنت میں شامل تھے جس کا نواب سعد اللہ خان کم سے کم بھی اڑتالیس سال وزیر اعظم رہا(محمود احمد غازی، ڈاکٹر، مسلمانوں کا دینی و عصری نظامِ تعلیم: مسلمانوں کی تعلیمی روایت اور عصرِ حاضر، الشریعہ اکادمی، ہاشمی کالونی کنگنی والا، گوجرانوالہ، ص57)

[5]استاد احمد لاہوری، انجینئر (1580ء۔1649ء) کے آباؤ اجداد ایرانی تھے، لاہور میں پیدا ہوئے، بدخشاں خاندان سے تعلق تھا۔استاد احمد لاہوری نے تاج محل 1632ء۔1648ء میں مکمل کیا، اس کے علاوہ دیگر بہت سی تاریخی عمارتوں کے معمار اعلیٰ ان کو ہی مانا جاتا ہے، ان کے بیٹے شاعر لطف اللہ کے بقول لال قلعہ دہلی بھی انہوں نے ہی تعمیر کرایا تھا اور غالب گمان بھی یہی ہے ۔ Jean-Louis Nou, Amina Okada, *TajMahal*, ImprimerieNationale, Paris 1993, p. 19-20

[6]محمود احمد غازی، ڈاکٹر، دینی مدارس: مفروضے، حقائق، لائحہ عمل؟(مشمولہ: سلیم منصور خالد، دینی مدارس میں تعلیم) انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی سٹڈیز عالمی ادارہ فکر اسلامی، اسلام آباد طبع سوم 2005ء، ص62، 61

[7]آکسفورڈ میں قائم انگلش دنیا کی پرانی ترین یونیورسٹی جو اپنی بڑی منفرد اور تاریخی حیثیت رکھتی ہے۔اس کی کب ابتداء ہوئی اس کی کوئی حتمی تاریخ نہیں مگر 1096ء میں کسی نہ کسی شکل میں اس میں تعلیمی کام

ہو رہا تھا۔ پھر اس یونیورسٹی نے 1167ء میں تیزی سے ترقی کی۔ جب ہنری دوم نے انگریزی طالب علموں پر پابندی لگادی کہ وہ فرانس کی یونیورسٹیوں میں نہیں پڑھیں گے۔ لیکن آج دنیا میں آکسفورڈ یونیورسٹی اپنا ایک نام اور مقام رکھتی ہے ۔

ww.ox.ac.uk/about/organization/history ?wssi=1

Retrieved 2017/12/11

[8] کیمبرج انگلستان کی ایک قدیم یونیورسٹی، دریائے کیم کے کنارے واقع ہے۔ جس کی مناسبت سے اس مقام کو کیم برج یعنی دریائے کیم کے پل کے نام سے موسوم کیا گیا۔ یہ یونیورسٹی دنیا بھر میں مشہور ہے اس کا سب سے پہلا کالج پیٹر ہاؤس کالج کے نام سے 1284ء میں کھولا گیا۔ جو بشپ ایلے (Bishop of Ely) نے کھولا۔ ان کے لیئے جو یونیورسٹی کے قدیم ترین ریکارڈ کے مطابق 1209ء میں کچھ سکالرز کے گروپ آئے جو کیمبرج کے قدیم رومی تجارتی مرکز میں علم کے لیئے جمع ہوئے تھے۔

(ww.Cam.ac.uk/about-the-university/history/timeline

(Retrieved 2017/12/10

[9] ایس ایم زمان، ڈاکٹر، دینی مدارس اور خود احتسابی کی راہ، (مشمولہ: سلیم منصور خالد، دینی مدارس میں تعلیم) ص38

[10] ڈاکٹر محمود احمد غازی (18 ستمبر 1950ء-25 ستمبر 2010) حافظ محمد احمد فاروقی کے ہاں دہلی میں پیدا ہوئے۔ آپ نے آٹھ سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کر لیا تھا۔ آپ نے لسانیات میں بہت عبور حاصل کیا اور پنجاب یونیورسٹی سے 1972ء میں ایم اے عربی کی ڈگری حاصل کی 1988ء میں آپ نے پنجاب یونیورسٹی سے اسلامک سٹڈیز میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ آپ نے ملکی و بین الاقوامی سطح پر متعدد جامعات کی تشکیل میں بھرپور حصہ لیا۔ بین الاقوامی یونیورسٹی کے صدر بھی رہے۔ دو بار اسلامی نظریاتی کونسل کے رکن مقرر ہوئے۔ وزارتِ مذہبی امور کا قلمدان بھی آپ کے سپرد رہا۔ فیصل مسجد اسلام آباد کے خطیب بھی رہے۔ عربی جریدہ "الدراسات الاسلامیہ" کے ایڈیٹر اور معروف علمی رسالہ فکر و نظر (اردو) کے ایڈیٹر کی حیثیت سے کئی برس کام کیا۔ آپ متعدد اداروں کے مشیر تھے اور تقریباً 30 کتب کے مصنف تھے جن میں سے 7 کتب انگریزی زبان میں، 5 کتب عربی میں اور 18 کتب اردو زبان میں لکھی گئیں۔ ڈاکٹر محمود احمد غازی مسلسل اس جدوجہد میں رہے کہ دنیائے اسلام میں بالعموم اور پاکستان میں بالخصوص دینی و اسلامی تعلیم کا ایک جامع اور متوازن نظام متعارف کرایا جائے۔ اس سلسلہ میں آپ نے تحریر و تقریر کے ذریعہ ایسے رجال کار تیار کرنے پر بھی محنت کی جو آپ کی اس فکر کو زندہ رکھیں اور ملک میں اس کے نفاذ کی سعی جاری رکھیں۔

(جسٹس سید افضل حیدر ،ڈاکٹر محمود احمد غازی :ایک اسم با مسمیٰ، ماہنامہ الشریعۃ ، خصوصی اشاعت بیاد ڈاکٹر محمود احمد غازی، جنوری/فروری 2011ء، گوجرانوالہ، ص 71)

[11] منطق کے لغوی معنی گفتگو کرناہیں،اصطلاح میں ایسے قوانین کو جانناجن کالحاظ اور رعایت ذہن کو غور وفکر میں غلطی سے بچالے۔منطق ایک قدیم سائنسی علم ہے جس میں کسی بھی لفظ کی تعریف اور استدلال کے طریقہ کار اور اصولوں پر بحث کی جاتی ہے۔اس کا بانی ارسطو کو قرار دیا جاتا ہے۔منطق لفظ نطق کا مصدر میمی ہے۔جس کے معنی ہیں، گفتگو کرنا کیوں کہ یہ علم ظاہری و باطنی نطق میں نکھار پیدا کرتا ہے اس لیئے اسے منطق کہتے ہیں۔ نطق ظاہری میں نکھار سے مراد یہ ہے کہ اس علم کا جاننے والا دوسروں کے مقابلہ میں اچھے انداز سے گفتگو کر سکتا ہے اور منطقِ باطنی میں نکھار سے مراد یہ کہ اس علم کا جاننے والا اشیاء کے حقائق یعنی ان کی اجناس اور فصول وغیرہ سے واقف ہو جاتا ہے

ww.javedahmadghamidi.com/books/view/mantaq-

[12] اورنگزیب عالمگیر (3نومبر 1618ء- 3مارچ 1707ء)نام محی الدین،لقب اورنگ زیب،ان کے والد نے ان کو عالمگیر کا خطاب دیا۔ان کا دورِ حکومت 49سال رہا۔1658ء سے 1707ء تک انہوں نے حکومت کی۔مغلیہ دور کے چھٹے اور آخری بہترین حکمران تھے جو اپنا ایک مقام اور مرتبت رکھتے تھے

(Bayly,C.A.(1990).Indian society and the making of the British Empire(1 stpbk.ed.)Cambridge[England]:Cambridge University press.p.7)

[13] نظام الدین سہالوی(1677ء-1748ء) کے والد ماجد کا نام ملا قطب الدین سہالوی ہے۔ سہالی کی طرف نسبت ہے۔اپنے دور کے معروف عالمِ دین اور فتاویٰ عالم گیری کی مجلسِ تدوین کے سربراہ تھے۔ اورنگ زیب عالم گیر (1707ء) نے ملا نظام الدین سہالوی کو یہ ذمہ داری سونپی کہ وہ ایک جامع نصاب مرتب کریں . ملا نظام الدین نے جو نصاب مرتب کیا وہ ان کے نام سے درسِ نظامی کہلایا

(ZiaulHaasanFaruqi Some aspects of Muslim education and Culture .(Islam and the modern age10 (2), may1979) P 50-52

[14] فرنگی محلبھارت کے شہر لکھنؤ میں وکٹوریہ روڈ اور چوک کے درمیان واقع ہے۔ عظیم الشان یادگار عمارت کا فرنگی نام اس لیئے پڑا کیوں کہ اولین مالک یورپ سے تعلق رکھتے تھے۔ مغل شہنشاہ اورنگزیب کے دورِ حکومت میں دیگر فرانسیسی تاجروں کے ساتھ یہاں رہنے والے نیل (Neil) نامی ایک فرانسیسی اس عمارت کا اولین مالک تھا یہ ایک شاندار رہائش گاہ تھی، تاہم یہ ایک غیر ملکی کی ملکیت تھی اور اسی سبب سے ایک شاہی فرمان کے تحت حکومت کی طرف سے اسے ضبط کیا گیا تھا یہ عمارت قرقی کے بعد اسلامی معاملات پر بادشاہ کے مشیر ملا قطب الدین شہید کے دونوں بیٹوں ملا سعید اور ملا اسد کی تحویل میں دے دی گئی ان دونوں بھائیوں نے اس رہائشی مرکز کو ایک عظیم الشان اسلامی ادارے میں تبدیل کر دیا تھا جس کی حیثیت اکثر انگلینڈ کے کیمبرج اور آکسفورڈ یونیورسٹیوں کے ساتھ مقابلتاً پیش کی جاتی تھی۔ واضح رہے کہ ملا نظام الدین بھی ملا قطب الدین شہید کے بیٹے تھے جن کی طرف درسِ نظامی منسوب ہے ، (www.nativeplanet.com /lucknow/attract/tions/farangi- mahalRetrivied 2017/20/12)

[15] محمود احمد غازی، ڈاکٹر، محاضراتِ تعلیم، (مرتب: ڈاکٹر سید عزیز الرحمن) زوار اکیڈمی پبلی کیشنز کراچی، طبع سوم 2016ء، ص 313-316

[16] برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی (British East India Company) جزائر شرق الہند میں کاروباری مواقع کی تلاش کے لیئے تشکیل دیا گیا ایک تجارتی ادارہ تھا۔ بعدازاں اس نے برسغیر میں کاروبار پر نظریں مرکوز کر لیں اور برِصغیر پر برطانیہ کے قبضے کی راہ ہموار کی۔ 1857ء کی جنگِ آزادی تک ہندوستان میں کمپنی کا راج تھا اس کے بعد براہِ راست تاجِ برطانیہ زیر نگیں آ گیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کو 1600ء میں ملکہ الزبتھ اوّل کے عہد میں ہندوستان سے تجارت کا پروانہ ملا، یہاں سے مصالحہ جات برآمد کر کے یورپ میں مہنگے داموں بیچا جاتا تھا۔ (A.J Farrington , Trading Places: the East India Company and Asia, 1600-1834 (London: British Library , 2002)

[17] محمود احمد غازی، ڈاکٹر، دینی مدارس: مفروضے، حقائق، لائحہ عمل؟ (مشمولہ: سلیم منصور خالد، دینی مدارس میں تعلیم) ص 66

[18]سعید الرحمن ،ڈاکٹر، مدرسہ کا نظامِ تعلیم : پس منظر، مسلکی اثرات اور مطلوبہ مقاصد ،(مرتب : شمس الرحمن وغیرہ)،(مشمولہ پاکستان میں مدارس کی تعلیم روایت و تغیرات ) شعبہ علومِ اسلامیہ بہاءالدین زکریایونیورسٹی ملتان طبع اول2016ء،ص23

[19]ایضاًص24

[20] قاسمی، مولانا قاری محمد طیب، جدوجہد آزادی کا رہنماادارہ، شاہ ولی اللہ میڈیا فاؤنڈیشن ملتان، ص6

[21] شاہ معین الدین،ڈاکٹر ،دینی مدارس کا نظام و نصاب : ڈاکٹر محمود احمد غازی کے افکار سے استفادہ، معارفِ اسلامی ، خصوصی اشاعت ،کلیہ عربی وعلومِ اسلامیہ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد ،2011ء، ص177 بحوالہ: پہلی سالانہ رپورٹ، پاکستان مدرسہ ایجوکیشن بورڈ،اسلام آباد، ص90

[22]سیکولرازم( Secularism) اس سے مراد دنیاوی امور سے مذہب اور مذہبی تصورات کی بے دخلی ہے۔ سیکولرازم جدید دور اور روایتی مذہبی اقدار سے دور جانے کی ایک تحریک ہے۔ سیکولرازم کو اردو میں مذہبی غیر جانب داری یالادینیت سے تعبیر کیا جاتا ہے سب سے پہلے George Jacab Holyoake ( 1817۔1906)نے 1851ء میں یہ اصطلاح دراصل چرچ اور ریاست کو الگ کرنے کے لیئے استعمال کی تھی۔ گویا سیکولرازم دراصل سیاست اور مذہب کے مابین تفریق کا نام ہے ۔ Holyoake , G j (1896) The Origin and nature of Secularism, London :Watts and Co .P.51

[23]محمود احمد غازی،ڈاکٹر، مسلمانوں کا دینی وعصری نظامِ تعلیم، ص19،20

[24] "The emperor's" then he said to them , " Give Therefore to the emperor the things that are the emperor's , and to God the things that are God's " (Matthew 22:21)

[25]محمود احمد غازی،ڈاکٹر، دینی مدارس: مفروضے، حقائق، لائحہ عملص67

[26]ایضاً، ص62

[27]ابو حامد محمد الغزالی طوسی(450ھ-505ھ/1058ء1111ء)، نیشاپور سے تعلق تھا، طوس میں پیدا ہوئے آپ کے مشہور اساتذہ میں امام عبدالملک الجوینی م478ھ ہیں جو امام الحرمین کے نام سے مشہور ہیں۔ جو فقہ شافعی کے مشہور فقیہ تھے اور آپ کے مشہور شاگردوں میں ابو بکر محمد بن عبداللہ(م

543ھ) جوابن العربی کے نام سے معروف ہیں۔آپ پانچویں صدی ہجری کے مشہور اصولی فلسفی فقیہ تھے۔اشعری متکلمین میں اونچا مقام تھا،فقہ شافعی کی ممتاز شخصیات میں سے تھے،امام غزالی حجۃ الاسلام ،زین الدین،اوران جیسے کئی القابات سے معروف ہیں۔امام غزالی کئی کتب کے مصنف ہیں ان میں سے چند یہ ہیں،احیاءعلوم الدین،المنقذ من الضلال،المستصفی،تہافۃ الفلاسفۃ غیرہ۔ان کی شہرہ آفاق تصنیف احیاءعلوم الدین ایک مقدمہ اور چار حصوں پر مشتمل ہے پہلا حصہ عبادات ہر مشتمل ہے،دوسرا عادات پر تیسرا حصہ مہلکات پر اور چوتھا منجیات پر مشتمل ہے اور ہر حصہ دس،دس ذیلی کتب پر مشتمل ہے۔ (جمال الدین فالح الکیلانی : الشیخ عبدالقادر الکیلانی رؤیۃ تاریخیۃ معاصرہ،مؤسسۃ مصر مرتضی،بغداد2011ء،ص63)

[28]محمد بن عمر، کنیت ابو عبداللہ،لقب فخر الدین رازی ( 544ھ۔606ھ)ہے۔والد مرحوم ضیاء الدین عمر خطیب کے نام سے معروف تھے اس لیئے آپ ابنِ خطیب بھی کہلاتے ہیں۔آپ چھٹی صدی ہجری کی نابغہ روزگار شخصیت ہیں۔آپ نے اپنے والد ماجد سے علم میں مہارت حاصل کی، تفسیر،کلام، عقلی علوم اور لغوی علوم کے ماہر تھے۔وعظ گوئی کے حوالہ سے بھی شہرت رکھتے تھے۔علمِ کلام میں المطالب العالیہ،اصولِ فقہ میں المحصول اور حکمت میں شرح الاشارات ان کی معروف تصانیف ہیں۔کہا جاتاہے کہ کرامیہ نے ان سے شدید اختلاف کے سبب انہیں زہر دیا تھا۔(،ڈاکٹر محمد حسین الذہبی،التفسیر و المفسرون ،ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ کراچی پاکستان ،ص290۔293)

[29]محمود احمد غازی،دینی مدارس میں تعلیم، مفروضے، حقائق،لائحہ عمل، ص 72،73

[30]ایضاً،ص62

[31]ایضاً،مسلمانوں کادینی وعصری نظام تعلیم،ص168

[32]ایضاً ،مغرب کا فکری و تہذیبی چیلنج اور علماء کی ذمہ داریاں ،الشریعہ اکادمی ،ہاشمی کالونی،کنگنی والا ،گوجرنوالہ2007ء،ص29

[33]الحصری، القیروانی،ابراھیم بن علی، ابو اسحق، زہر الآداب والثمر الباب ، دار الجیل بیروت ، ج 1، ص 73

[34]محمود احمد غازی،ڈاکٹر،دینی مدارس: مفروضے، حقائق،لائحہ عمل؟(مشمولہ: سلیم منصور خالد،ص69

[35]الدمشقی ،الشافعی ، عبد الباسط بن موسی :المعید فی ادب المفید و المستفید ،مکتبۃ الثقافۃ الدینیۃ،ج1،ص96

[36]محمد بن حسن بن فرقد الشیبانی، کنیت ابو عبداللہ ( 131ھ/748ء - 805ء/189ھ)امام ابو حنیفہ کے مایہ ناز شاگرد اور فقہ حنفی کے مدون شمار ہوتے ہیں، آپ شہر واسط میں پیدا ہوئے اور رُے میں وفات پائی۔اللہ تعالیٰ نے امام محمد بن حسن کو بے نظیر ذکاوت، گہری سمجھ، مضبوط حافظہ اور زرخیز قانون ساز دماغ سے نوازا تھا۔اس کے ساتھ ساتھ آپ فقہ، حدیث اور لغت کے امام تھے۔آپ پوری دنیا میں قانونی فکر کے بڑے بڑے ماہرین میں سے ایک تھے،اور بجا طور پر پوری انسانیت کو آپ جیسی نابغہ روزگار پر فخر و ناز کرنے کا حق ہے۔کتب ظاہر الروایۃ کے مصنف ہیں۔ (محمد الدسوقی،ڈاکٹر،امام محمد بن حسن شیبانی اور ان کی فقہی خدمات(مترجم حافظ شبیر احمد جامعی،ڈاکٹر محمد یوسف فاروقی) ادارہ تحقیقات اسلامی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی،اسلام آباد، ص95،99

[37]محمود احمد غازی،ڈاکٹر، مسلمانوں کا دینی وعصری نظامِ تعلیم، ص30

[38]محمد الدسوقی،ڈاکٹر،امام محمد بن حسن شیبانی اور ان کی فقہی خدمات، ص388

[39]محمد امین ابن عابدین شامی، شرح عقود رسم المفتی، ترجمہ:سعید احمد پالن پوری، (مکتبہ البخاری، کراچی ،س۔ن)ص119

[40]ابن ِ ہشام، ابو محمد،عبد الملک، السیرۃ النبویۃ، شرکت مکتبۃ و مطبعۃ مصطفی البابی الحلبی مصر،ج2،ص478

[41]البیہقی ،ابو بکر، احمد بن الحصین ، دلائل النبوۃ و معرفۃ احوال صا حب الشریعۃ، دار الکتب العلمیۃ بیروت، ج5،ص161

[42]محمود احمد غازی،ڈاکٹر : دینی مدارس: مفروضے حقائق،لائحہ عمل، ص70 مِنجنیقایک آلہ جس سے بڑے بڑے پتھر پھینکے جاتے تھے۔سنگباری کی قدیم دستی مشین۔جمع مناجیق۔(فیروز الدین، مولوی ،فیروز اللغات، فیروز سنز لمیٹڈ لاہور2011ء،مادہ م۔ن)

[43]الغزالی ، ابو حامد ، محمد ، طوسی، احیا ء علوم الدین ،دار المعر فۃ بیروت ، ج1 ،ص 16 ،43، 21،

[44]ابن تیمیہ ، احمد بن عبد الحلیم ،ابو العباس ،تقی الدین ،الحسبہ فی الاسلام ، دار الکتب العلمیہ ، ج 1، ص24(امام ابنِ تیمیہ 621ھ/1263ء میں

پیدا ہوئے اور 728ھ/1328ء میں وفات پائی۔آپ کے شاگردوں میں امام ابن قیم اور مفسر قرآن ابن کثیر جیسی شخصیات شامل ہیں۔عہد مملوکی کے نابغہ روزگا علماء میں سے تھے۔آپ نے عقائد،فقہ،رد فرق باطلہ،تصوف اور سیاست سمیت ہر موضوع پر قلم اٹھایا۔)

[45]فرضِ کفایسے مراد شریعت کا وہ حکم ہے جس کی تعمیل اجتماعی طور پر مطلوب ہوتی ہے اور ہر ہر فرد سے اس کے بجالانے کا تقاضا نہیں کیا جاتا لہذا اگر اس حکم کو چند افراد ادا کر لیں تو باقی لوگوں کی ذمہ داری نہیں رہتی لیکن اگر اس کو کوئی بھی ادا نہ کرے تو تمام لوگ اس کے جواب دہ ہوتے ہیں۔مثلاً امر بالمعروف و نہی عن المنکر، جہاد،افتاء، نماز جنازہ، ضروری صنعتوں اور پیشوں کا ہونا وغیرہ ۔(زیدان ،عبد الکریم ، ڈاکٹر ، الوجیز فی اصولِ الفقہ،اسلامی اکادمی اردو بازار ، لاہور پاکستان ،ص 36)

[46]محمود احمد غازی : ڈاکٹر،دینی مدارس:مفروضے حقائق،لائحہ عمل،ص73

[47]الترمذی ،محمد بن عیسی ، السنن ،ابو اب العلم، باب ما جا ء فی فضل الفقۃ علی العبادۃ ، حدیث : 2687

[48]المستصفی من علم الاصول ،امام ابو حامد الغزالی (450ھ -505ھ ) کی شہرہ آفاق تصنیف ہے یہ کتاب مقدمہ اور چار اقطاب پر مشتمل ہے جو بنیادی محور ہیں ۔ (1)احکام (2) ادلۃ (3) استثمار (استدلال)(4)المستثمر (مجتہد)پر مشتمل ہیں۔یہ متکلمین کے طریقہ پر لکھی گئی ہے۔( الغزالی ، المستصفی من علم الاصول : ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ،کراچی،پاکستان،1987ء) ص 5

[49]تفسیرِ کبیر، محمد بن عمر کنیت ابوعبداللہ لقب فخر الدین رازی544ھ۔606ھ کی عربی تفسیر قرآن ہے ۔جس کا اصل نام "مفاتیح الغیب" ہے۔کہا جاتا ہے کہ مشکلات قرآن میں سے کوئی ایسی مشکل نہیں جس کا حل امام صاحب نے اس میں نہ فرمایا ہو،امام موصوف پر معقولات کا غلبہ تھا، تفسیر میں بھی وہی رنگ پایا جاتا ہے۔زبان بہت عمدہ استعمال کی ہے۔فقہی مسائل میں شافعی مسلک کی ترجمانی کی ہے اس تفسیر میں معتزلہ،جبریہ،قدریہ وغیرہ کا بہت رد کیا گیا ہے۔آیات کا شانِ نزول بھی بیان کیا ہے ۔احادیث کا ذکر بھی جابجا ملتا ہے آیات سے عمدہ اور نفیس نکات کا استنباط کیا گیا ہے۔ (الذہبی ،محمد حسین ،ڈاکٹر ،التفسیر و المفسرون : ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ کراچی پاکستان ،ص290-293)

[50]الموافقات فی اصول الفقہ،امام ابراھیم بن موسی الشاطبیؒ(م790ھ/1388ء)کی تصنیف ہے۔یہ کتاب پانچ اقسام پر مشتمل ہے۔پہلی قسم میں تیرہ مقدمات مذکور ہیں۔دوسری قسم الاحکام (جس میں پانچ احکامِ تکلیف اور پانچ احکامِ وضع شامل ہیں) تیسری قسم مقاصدِ شریعہ،چوتھی قسم الادلۃ اور پانچویں احکام الاجتھاد والتقلید کے عنوانات پر مشتمل ہے۔(الشاطبی ، ابو اسحق،ابراھیم بن موسی ، الموافقات،دار ابن عفان طبعۃ رابعۃ 2013ء)

[51]حجۃ اللہ البالغہ ،امام شاہ ولی اللہ 1703(ء- 1763ء)کی شاہکار تصنیف ہے۔آپ محدث اعظم ،مفسرِ قرآن اصولِ تفسیر اور اسرارِ شریعت کے موجد و مدون ہیں۔آپ کا پورا نام ولی اللہ قطب الدین احمد ہے اور تاریخی نام عظیم الدین،کنیت ابو عبد العزیز اور ابو الفیاض ہے۔آپ کے والد ماجد کا نام شاہ عبد الرحیم دہلوی ہے۔آپ کا سلسلہ نسب والد ماجد کی طرف سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ تک اور والدہ ماجدہ کی طرف سے حضرت موسیٰ کاظمؒ تک پہنچتا ہے۔آپ کی شہرہ آفاق تصنیف دو جلدوں پر مشتمل ہے۔حجۃ اللہ البالغہ کے معنی کامل برہانِ الٰہی،یہ کتاب دو جلدوں پر مشتمل ہے۔شاہ صاحب کی اس کتاب کا موضوع تکلیفِ شرعی کے اسرار و رموز،مجازات کی حکمت اور احکامِ شریعہ کے مبنی بر حکمت و مصالح پر مشتمل ہیں۔( محمد شریف سکر ، تعارفی مقدمہ حجۃ اللہ البالغہ (شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ) قدیمی کتب خانہ مقابل آرام باغ ،کراچی ،ص13 وغیرہ )

[52]محمود احمد غازی،ڈاکٹر:دینی مدارس،مفروضے،حقائق،لائحہ عمل،ص29

[53] ؎،مسلمانوں کا دینی وعصری نظامِ تعلیم،ص31　　ایضا

[54]دینی مدارس،مفروضے،حقائق،لائحہ عمل،ص24،23،35

[55]محمود احمد غازی،ڈاکٹر:مسلمانوں کا دینی وعصری نظامِ تعلیم،ص20

[56]ایس ایم زمان،ڈاکٹر:دینی مدارس اور خود احتسابی کی راہ(مشمولہ:سلیم منصور خالد،دینی مدارس میں تعلیم)،ص39

[57]قریظہ کے معنی اس درخت کے تھے جو دباغت کے کام آتا تھا چوں کہ پیشے کے اعتبار سے یہ لوگ چمڑے کی صنعت میں جوتا سازی کا کام کرتے تھے اس لیئے دیگر یہودی انہیں حقیر سمجھتے تھے۔ان کا خون بہا بھی بنو نضیر کے یہود کی بہ نسبت آدھا ہوتا تھا۔آنحضرت ﷺ نے اس ناانصافی کو ختم فرما کر ان کی حیثیت دوسروں کے برابر کردی۔بنو نضیر کی جلاوطنی کے موقع پر ان سے دوبارہ معاہدہ کی تجدید فرمائی،

باوجود ان مراعات کے غزوہ احزاب کے موقع پر انہوں نے مسلمانوں سے غداری کی۔ حیی بن اخطب کے بھڑکانے سے معاہدہ سے انحراف کر کے قریش سے مل گئے اور مسلمان نہایت مشکل میں گھر گئے۔ اس نازک موقع پر جب انہیں یاد دلانے کی کوشش کی تو جواب دیا "ہم نہیں جانتے محمد ﷺ کون ہیں ؟اور معاہدہ کیا ہے ؟" (مصباح الدین شکیل، شاہ، سیرت احمد مجتبیٰ ﷺ پاکستان اسٹیٹ آئل کمپنی لمیٹڈ کراچی، ج 3، ص 31-32)

[58]البخاری،محمد بن اسما عیل، ابو عبد الله : الجامع المسند الصحیح ، کتاب الجمعۃ ، باب من صلاۃ الطالب والمطلوب راکبا و ایماء ، حدیث 946:

[59]محمود احمد غازی، ڈاکٹر: محاضراتِ تعلیم، (مرتب: ڈاکٹر سید عزیز الرحمن)، ص 362

[60]امام محمد بن عبداللہ بن بہادر، بدر الدین، الزرکشی (م 794ھ) علمِ تفسیر کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ علمِ تفسیر ایسا علم جس کے ذریعہ کتاب اللہ جو رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوئی اور اس کے معنی کی وضاحت، اس کے احکام اور اس کی حکمتوں کو اخذ کرنے کا فہم حاصل کیا جاتا ہے۔ ( السیوطی ، جلال الدین ، الا تقان فی علوم القرآن ، مطبعۃ مصطفی الحلبی ، ج 2 ص 174 )

[61]علوم القرآن سے دو قسم کے علوم مراد لیئے جاتے ہیں۔ ایک تو وہ علوم ہیں جو قرآن حکیم میں مذکور یا اس سے ماخوذ ہیں اور جو علم و حکمت کا خزینہ اور ہدایت و معرفت کا سرچشمہ ہیں۔ یہ وہ علوم ہیں جن پر انسان کی اعتقادی، عملی، اخلاقی اور تمدنی اصلاح اور اس کی دنیاوی اور اخروی فلاح موقوف ہے۔ تفصیل کے لیئے دیکھئے جلال الدین عبدالرحمن بن ابی بکر، السیوطی (م 911ھ) کی الاتقان فی علوم القرآن اور بدالدین محمد بن عبداللہ بن بہادر الزرکشی (م 794ھ) کی البرھان فی علم القرآن۔ جب کہ امام شاہ ولی اللہ نے الفوز الکبیر میں ان علوم کو پانچ جامع اقسام میں تقسیم کیا ہے۔ (1) علم المخاصمہ (2) علم الاحکام (3) علم تذکیر بالاءاللہ (4) علم تذکیر بایام اللہ (5) علم تذکیر بموت ومابعد الموت۔ دوسری قسم ان علوم کی ہے جو قرآن حکیم سے متعلق ہیں جن سے مفہوم قرآن میں مدد ملتی ہے

[62]محمود احمد غازی، ڈاکٹر، مغرب کا فکری و تہذیبی چیلنج، ص 30 تا 32

[63]ایضاً، دینی مدارس : مفروضے، حقائق، لائحہ عمل ؟ ص 77، 78